

تفہیم القرآن

البَلَد

نام | پہلی ہی آیت لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ کے لفظ البلد کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔
 زمانہ نزول | اس کا مضمون اور انداز بیان مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی سورتوں کا سا ہے مگر
 ایک اشارہ اس میں ایسا موجود ہے جو پتہ دیتا ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ وہ تھا جب
 کفار مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پڑ چکی تھی اور آپ کے خلاف ہر ظلم و
 زیادتی کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا تھا۔

موضوع اور مضمون | اس سورے میں ایک بہت بڑے مضمون کو چند جملوں میں سمیٹ
 دیا گیا ہے اور یہ قرآن کا کمال ایجاز ہے کہ ایک پورا نظریہ حیات، جسے مشکل سے ایک
 ضخیم کتاب میں بیان کیا جاسکتا تھا، اس چھوٹی سی سورۃ کے چھوٹے فقروں میں
 نہایت مؤثر طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور
 انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت
 اور شقاوت کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے ہیں، اُن کو دیکھنے اور اُن پر چلنے کے
 وسائل بھی اُسے فراہم کر دیئے ہیں، اور اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر
 موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ
 اختیار کر کے بُرے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

سب سے پہلے شہر مکہ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرنے والے
 مصائب اور پوری اولادِ آدم کی حالت کو اس حقیقت پر گواہ کی حیثیت سے پیش

کیا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے جس میں وہ فرے اڑنے کے لیے پیدا کیا گیا ہو، بلکہ یہاں اس کی پیدائش ہی شقت کی حالت میں ہوتی ہے۔ اس مضمون کو اگر سورہ نجم کی آیت ۳۹ کَبِئْسَ لِلْإِنْسَانِ الْأَمَّاسُخِ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کارگاہ دنیا میں انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش اور محنت و مشقت پر ہے۔

اس کے بعد انسان کی یہ غلط فہمی دور کی گئی ہے کہ یہاں بس وہی وہ ہے اور اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جو اُس کے کام کی نگرانی کرنے والی اور اُس پر مواخذہ کرنے والی ہو۔

پھر انسان کے بہت سے جاہلانہ اخلاقی تصورات میں سے ایک چیز کو بطور مثال لے کر بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اُس نے بُرائی اور فضیلت کے کیسے غلط معیار تجویز کر رکھے ہیں۔ جو شخص اپنی کبرائی کی نمائش کے لیے ڈھیروں مال لٹاتا ہے وہ خود بھی اپنی ان شاہ خرچیوں پر فخر کرتا ہے اور لوگ بھی اسے خوب داد دیتے ہیں، حالانکہ جو ہستی اُس کے کام کی نگرانی کر رہی ہے وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُس نے یہ مال کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں کس نیت اور کن اغراض کے لیے خرچ کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو علم کے ذرائع اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دے کر اُس کے سامنے بھلائی اور بُرائی کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے ہیں۔ ایک راستہ وہ ہے جو اخلاق کی پستیوں کی طرف جاتا ہے اور اس پر جانے کے لیے کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی بلکہ نفس کو خوب لذت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا راستہ اخلاق کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے جو ایک دشوار گزار گھاٹی کی طرح ہے کہ اُس پر چلنے کے لیے آدمی کو اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اس گھاٹی پر چڑھنے کی نسبت کھد میں ٹھکنے کو ترجیح دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے جس سے گزر کر آدمی بلندیوں کی طرف جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ریا اور فخر اور نمائش کے خرچ چھوڑ کر آدمی اپنا مال غیبیوں اور

مسکینوں کی مدد پر غور کرے، اللہ اور اس کے دین پر ایمان لائے، اور ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں حصہ لے جو صبر کے ساتھ حق پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور خلق خدا پر رحم کھانے والا ہو۔ اس راستے پر چلنے والوں کا انجام یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو، اور اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس سے نکلنے کے سارے دروازے بند ہیں۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے
 نہیں، نین قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور حال یہ ہے کہ (اے نبی،) اس شہر میں تم کو حلال کر لیا گیا ہے، اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی۔ درحقیقت ہم نے اس سے پہلے ہم سورہ قیامہ حاشیہ نمبر ۱ میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کلام کا آغاز نہیں سے کرنا اور پھر قسم کھا کر آگے کی بات شروع کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ لوگ کوئی غلط بات کہہ رہے تھے جس کی تردید کرنے ہوئے فرمایا گیا کہ نہیں، بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو، بلکہ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ بات کیا تھی جس کی تردید میں یہ کلام نازل ہوا، تو اس پر بعد کا مضمون خود دلالت کر رہا ہے۔ کفار مکہ یہ کہتے تھے کہ ہم جس طرز زندگی پر چل رہے ہیں اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، دنیا کی زندگی بس یہی کچھ ہے کہ کھاؤ پیو، مرے اڑاؤ، اور جب وقت آئے تو مر جاؤ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ مخواہ ہمارے اس طرز زندگی کو غلط ٹھہرا رہے ہیں اور ہمیں ڈرا رہے ہیں کہ اس پر کبھی ہم سے باز پرس ہوگی اور ہمیں جزا و سزا سے سابقہ پیش آئے گا۔

۱۱ یعنی شہر مکہ کی۔ اس مقام پر یہ بات کھولنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس شہر کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔ اہل مکہ اپنے شہر کا پس منظر خود جانتے تھے کہ کس طرح ایک بے آب و گیاہ وادی میں انسان پہاڑوں کے درمیان حضرت ابراہیم نے اپنی ایک بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو یہاں لاکر بے سہارا چھوڑا، کس طرح یہاں ایک گھر نیا کر ایسی حالت میں حج کی منادی کی جبکہ دور دور تک کوئی اس منادی کا سننے والا نہ تھا، اور پھر کس طرح یہ شہر آخر کار تمام عرب کا مرکز بنا اور ایسا حرم قرار پایا کہ صد بار بس تک عرب کی سرزمین بے آئین میں اس کے سوا امن کا کوئی مقام نہ تھا۔

انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا اُس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُس پر کوئی قابو نہ پاسکے گا؟

۱۔ اصل الفاظ ہیں اَنْتَ حَلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ - اس کے تین معنی مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں اور آپ کے مقیم ہونے سے اس کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ شہر حرم ہے مگر ایک وقت آئے گا جب کچھ دیر کے لیے یہاں جنگ کرنا اور دشمنانِ دین کو قتل کرنا آپ کے لیے حلال ہو جائے گا۔ تیسرے یہ کہ اس شہر میں جنگل کے جانوروں تک کو مارنا اور وزخون تک کو کاٹنا اہل عرب کے نزدیک حرام ہے اور ہر ایک کو یہاں امن عیسر ہے، لیکن حال یہ ہو گیا ہے کہ اے نبی، تمہیں یہاں کوئی امن نصیب نہیں، تمہیں ستانا اور تمہارے قتل کی تدبیریں کرنا حلال کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں تینوں معنوں کی گنجائش ہے، لیکن جب ہم آگے کے مضمون پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ پہلے دو معنی اُس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور تیسرا مفہوم ہی اس سے میل کھاتا ہے۔

۲۔ چونکہ مطلقاً باپ اور اُس سے پیدا ہونے والی اولاد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور آگے انسان کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے باپ سے مراد آدم علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں، اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد سے مراد وہ تمام انسان ہیں جو دنیا میں پائے گئے ہیں، اب پائے جاتے ہیں اور آئندہ پائے جائیں گے۔

۳۔ یہ ہے وہ بات جس پر وہ قسمیں کھائی گئی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ انسان کے مشقت میں پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مرنے کرنے اور چین کی بھری بجائے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے یہ دنیا محنت اور مشقت اور سختیاں بھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شہر مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا۔ اس شہر مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں، حتیٰ کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے لیے امان ہے مگر اُن کے لیے نہیں ہے۔ اور ہر انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کے آخری سانس تک اس بات پر گواہ ہے کہ اُس کو قدم قدم پر تکلیف، مشقت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کو ہم بڑی سے بڑی قابلِ رشک حالت میں دیکھتے

کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟ کیا ہم نے ہو وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو ہر وقت اس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مر جائے یا اس کا ہتھکڑیاں لگا کر اس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ پیدا ہوا تو اتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے پڑے ہی سسک سسک کر مر جاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گر اڑتا تھا۔ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیرات سے اس کو گزرنا پڑا کہ کوئی تغیر بھی اگر غلط سمت میں ہو جاتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ یا ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اس اندیشے سے اس کو چین نصیب نہیں ہے کہ کہیں اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو جائے۔ وہ اگر فاتح عالم بھی ہے تو کسی وقت اس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اس کے اپنے سپاہیوں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے۔ وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطانہ پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کس طرح اس کی حفاظت کرے غرض کوئی شخص بھی بے غل و غش چین کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہے، کیونکہ انسان پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔

۱۵ یعنی کیا یہ انسان جو ان حالات میں گھرا ہوا ہے، اس غم سے میں مبتلا ہے کہ وہ دنیا میں جو کچھ چاہے کرے، کوئی بالاتر اقتدار اس کو پکڑنے اور اس کا سر نیچے کر دینے والا نہیں ہے؟ حالانکہ آخرت سے پہلے خود اس دنیا میں بھی ہر آن وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی تقدیر پر کسی اور کی فرمانروائی قائم ہے جس کے فیصلوں کے آگے اس کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ زلزلے کا ایک جھٹکا، ہوا کا ایک طوفان، دریاؤں اور سمندروں کی ایک طغیانی اسے یہ تباہی دینے کے لیے کافی ہے کہ خدائی طاقتوں کے مقابلے میں وہ کتنا بل بوتہ رکھتا ہے۔ ایک اچانک حادثہ اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو پا بج بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تقدیر کا ایک پٹا بڑے سے بڑے با اقتدار آدمی کو عرش سے فرش پر لا کر اتا ہے۔ عروج کے آسمان پر پہنچی ہوئی قوموں کی قسمتیں جب بدلتی ہیں تو وہ اُسی دنیا میں دلیل و خوار ہو کر رہ جاتی ہیں جہاں کوئی اُن سے آنکھ ملانے کی سمیت نہ رکھتا تھا۔ اس انسان کے دماغ میں آخر کہاں سے یہ ہوا بھر گئی کہ کسی پر اس کا بس نہیں چل سکتا؟

عہ انْفَقْتُ مَا لَا ثَبَدَ اَ، میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا، نہیں کہا بلکہ اَهْلَكْتُ مَا لَا ثَبَدَ اَ کہا جس کے لفظی معنی ہیں میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا، یعنی کٹا دیا، یا اڑا دیا۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے

اسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیتے؛ اور دونوں نمایاں راستے اُسے نہیں ہیں کہ کہنے والے کو اپنی مال داری پر کتنا مخر تھا کہ جو ڈھیر سال اُس نے خرچ کیا وہ اُس کی مجموعی دولت کے مقابلے میں اتنا ہی سچ تھا کہ اُس کے لٹا دینے یا اڑا دینے کی اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ اور یہ مال اڑا دینا تھا کس مد میں؟ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود مترشح ہوتا ہے، بلکہ اپنی دوتمندی کی نمائش اور اپنے مخر اور اپنی بڑائی کے اظہار میں قصیدہ گو شاعروں کو بھاری انعامات دینا۔ شاوی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا جوئے میں ڈھیروں دولت بار دینا۔ جو اجیت جانے پر اُونٹ پر اُونٹ کاٹنا اور خوب بار دوستوں کو کھلانا۔ میلوں میں بڑے لاٹو لشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا۔ تقریبات میں بے شمار کھانے پکوانا اور اذن عام دے دینا کہ جس کا جی چاہے آئے اور کھائے، یا اپنے ڈیرے پر کھلا لنگر جاری رکھنا کہ دور و نزدیک یہ شہرت ہو جائے کہ فلاں رئیس کا دسترخوان بڑا وسیع ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی فیاضی اور فراخ دلی کی علامت اور اُس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ انہی پران کی تعریفوں کے ڈنکے بجاتے تھے۔ انہی پران کی مدح کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ اور وہ خود بھی ان پر دوسروں کے مقابلے میں اپنا مخر جتاتے تھے۔

۸۸ یعنی کیا یہ مخر جانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ کن ذرائع سے اس نے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا، اور کس نیت، کن اغراض اور کن مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخر کی کوئی قدر ہوگی؟ کیا اس کا خیال ہے کہ دنیا کی طرح خدا بھی اس سے دھوکا کھا جائے گا؟

۸۹ مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اُسے علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیئے؟ دو آنکھوں سے مراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں ہیں بلکہ نفسِ ناطقہ ہے جو ان آلات کی نثیت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے اور پھر ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔

۹۰ یعنی ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اُسے چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا اثر خود تلاش کرے۔

دکھا دیئے، مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گروں کو غلامی سے چھڑانا، یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا ناک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر اس کے ساتھ یہ کہ، آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں

بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی اور اس کے سامنے بھلائی اور بُرائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے نمایاں کر کے رکھ دیئے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کر لے۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ قصص میں فرمائی گئی ہے کہ ”ہم نے انسان کو ایک مضبوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سنسنے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا“ (آیات ۳۲) تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، الدہر، حواشی ۳ تا ۵۔

اللہ اصل الفاظ ہیں فَلَا أَفْتَحُمُ الْعَقَبَةَ۔ اِفْتَحَام کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقت طلب کام میں ڈالنا۔ اور عَقَبَةُ اُس دشوار گزار راستے کو کہتے ہیں جو بندی پر جانے کے لیے پہاڑوں میں سے گزرتا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دور راستے جو ہم نے اُسے دکھائے ان میں سے ایک بندی کی طرف جانا ہے مگر مشقت طلب اور دشوار گزار ہے۔ اُس میں آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے اور شیطان کی ترغیبات سے لڑ کر چلنا پڑتا ہے۔ اور دوسرا آسان راستہ ہے جو کھڈوں میں اُترتا ہے، مگر اُس سے پستی کی طرف جانے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ بس اپنے نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، پھر آدمی خود نشیب کی طرف گڑھکتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ آدمی جس کو ہم نے دونوں راستے دکھا دیئے تھے، اُس نے اُن میں سے پستی کی جانب جانے والے راستے کو اختیار کر لیا اور اُس مشقت طلب راستے کو چھوڑ دیا جو بندی کی طرف جانے والا ہے۔

۱۔ اوپر چونکہ اُس کی فضول خرچیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی بُرائی کی نمائش اور لوگوں پر اپنا فخر جتانے کے لیے کرتا ہے، اس لیے اب اس کے مقابلے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کونسا خرچہ اور مال کا کونسا حصہ ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بندیوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اُس میں نفس کی کوئی لذت نہیں بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے اِثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خرچہ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے، یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا خدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے، یا کسی غریب کی گروں قرض کے جال سے نکالے، یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی نادان

کے بوجھ سے لگ گیا ہو تو اس کی جان اُس سے چھڑے۔ اسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی ٹھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم (یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم) اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے اور نہ اُن کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دریا دلی کے وہ چہرے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شاندار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں، مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

ان آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بیان فرماتے ہیں۔ مثلاً نکتہ رقبہ (گردن چھڑانے) کے بارے میں حضور کی بکثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ کی یہ روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اُس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا، ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، ٹہر لگا کے بدلے میں ٹہر لگا دے گا۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابو ہریرہ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بکوا یا اور اُسی وقت اُسے آزاد کر دیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس غلام کے بیسے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی امام ابو حنیفہ اور امام شعبی نے اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدم رکھا ہے۔

مساکین کی مدد کے فضائل بھی حضور نے بکثرت احادیث میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ کی یہ حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا الساعی علی الارملة والمسکین کا ساعی فی سبیل اللہ واحسبہ قال کالقاتم لایفترو کالصابغ لایفطرو۔ بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔ اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ، مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضور نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے اور وہ جو پے درپے روزے رکھے اور کبھی روزہ نہ چھوڑے (بخاری و مسلم،

نیامی کے بارے میں تو حضورؐ کے بے شمار ارشادات ہیں۔ حضرت سہلؓ بن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اس طرح ہوں گے۔ یہ فرما کر آپؐ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو اٹھا کر دکھایا اور دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔ (بخاری)۔ حضرت ابو ہریرہؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ”مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک سلوک ہو رہا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بُرا سلوک ہو رہا ہو“ (ابن ماجہ۔ بخاری فی الادب المفرد)۔ حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ”جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محض اللہ کی خاطر پھیرا اُس بچے کے ہر مال کے بدلے جس پر اُس شخص کا ہاتھ گزرا اُس کے بیسے نیکیاں لکھی جائیں گی، اور جس نے کسی یتیم کے یا لڑکی کے ساتھ نیک برتاؤ کیا وہ اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے۔ اور یہ فرما کر حضورؐ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتائیں“ (مسند احمد۔ ترمذی)۔ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ سرکارِ رسالتؐ نے ارشاد فرمایا ”جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے اور پیئے میں شامل کیا اللہ نے اس کے لیے جنت واجب کر دی“ (البیہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ نہ کر بیٹھا ہو جو معاف نہیں کیا جاسکتا) (شرح السنہ)۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ”یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکین کو کھانا کھلا“ (مسند احمد)۔

سملہ یعنی ان اوصاف کے ساتھ ضروری ہے کہ آدمی مومن ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر نہ کوئی عمل صالح ہے اور نہ اللہ کے ہاں وہ مقبول ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابلِ قدر اور ذریعہ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔ مثلاً سورہ نساء میں فرمایا ”جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے“ (آیت ۱۲۴)۔ سورہ نحل میں فرمایا ”جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو اُن کا اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے“۔ (آیت ۹۷)۔ سورہ مومن میں فرمایا ”اور جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، وہاں اُن کو بے حساب رزق دیا جائے گا“ (آیت ۲۰)۔ قرآن پاک کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عمل صالح کے

نے ایک دوسرے کو صبر اور خلق خدا پر، رحم کی تلقین کی۔ یہ لوگ ہیں دانتیں بازو والے۔ اور جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بایں بازو والے ہیں۔ اُن پر آگ چھاتی ہوتی ہوگی۔

اجراور اس کی خبرائے خیر کا ذکر کیا گیا ہے وہاں لازماً اُس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے عمل بلا ایمان کو کہیں بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا ہے اور نہ اس کے کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔

اس مقام پر یہ اہم نکتہ بھی نگاہ سے مخفی نہ رہنا چاہیے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ”پھر وہ ایمان لائے“ بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ”پھر وہ اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لاتے“ اس کے معنی یہ ہیں کہ محض ایک فرد کی حقیقت سے اپنی جگہ ایمان لا کر رہ جانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہر ایمان لانے والا اُن دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جائے جو ایمان لاتے ہیں تاکہ اس سے اہل ایمان کی ایک جماعت بنے، ایک مومن معاشرہ جوڑ میں آئے، اور اجتماعی طور پر اُن بھلائیوں کو قائم کیا جائے جن کا قائم کرنا، اور اُن برائیوں کو مٹایا جائے جن کا مٹانا ایمان کا تقاضا ہے۔

لہذا یہ مومن معاشرے کی دو اہم خصوصیات ہیں جن کو دو مختصر فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔ اور دوسری یہ کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کریں۔ جہاں تک صبر کا تعلق ہے، ہم اس سے پہلے بار بار اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اُس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کی حرام کی ہوتی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب، اور محرومیوں سے ساقف پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بچ سکتا ہے۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرنے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک و قوم اور دنیا بھر کے شیاطین جن و انس کی فراحتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ راہِ خدا میں

ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔ اب یہ ظاہرات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہوگا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔ بخلات اس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمگیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اس معاشرے کے قدم چومیں گی۔ یدٰی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائیگی انسانی معاشرے کو بھلائی کے رستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائیگا۔ ہاجم تو اہل ایمان کے معاذ کی انتیازی شان ہی ہے کہ وہ ایک سنگدل بیرحم اور ظالم معاشرہ نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کے بے رحم و شفقتی اور پس میں ایک دوسرے کا ہمد و غم اور معاشرہ ہوتا ہے۔ رو کی حیثیت سے بھی ایک معن اللہ کی شان رحیمی کا مظہر ہے، اور جماعت کی حیثیت سے بھی مومنوں کا گروہ خدا کے اُس رسول کا نمائندہ ہے جس کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء-۱۰۶)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑھ کر جس بلند اخلاقی صفت کو اپنی امت میں فروغ دینے کی کوشش فرماتی ہے وہ یہی رحم کی صفت ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے حسب ذیل ارشادات ملاحظہ ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں اس کی کیا اہمیت تھی۔ حضرت جریر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَرْحَمُ اللَّهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ
اللہ اُس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔
(بخاری-مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا:

الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ - ارحموا رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر رحم من فی الارض یرحمکم من فی السماء عبد ابوداؤد ترمذی رحم کرو، آسمان والے تم پر رحم کرے گا۔
حضرت ابوسعید خدری حضور کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يَرْحَمُ (بخاری فی الادب المفرد، جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔)

ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَيْسَ مَثَلًا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرًا وَلَمْ يَوْقِرْ كَبِيرًا (ترمذی، وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ

کھائے اور بڑے کی توقیر نہ کرے۔)

ابو داؤد نے حضور کے اس ارشاد کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالہ سے یوں نقل کیا ہے :

من لم یرحم صغیرنا و یعرف حق کبیرنا فلیس منا۔ جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھایا اور ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابوالقاسم صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمانے سنا : لا تُنزع الرحمة الا من شقی (مسند احمد ترمذی) بدبخت آدمی کے دل ہی سے رحم سلب کر لیا جاتا ہے۔

حضرت عیاض بن حمار کی روایت ہے کہ حضورؐ نے خواباتین قسم کے آدمی جنتی ہیں۔ ان میں سے ایک : رجل رحیم رقیق القلب لکل ذی قربی و مسلم (مسلم) وہ شخص ہے جو ہر رشتہ دار اور ہر مسلمان کے لیے رحم اور رقیق القلب ہو۔

حضرت نعمان بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

تدري المومنین ونداحهم و نواذهم و تعاطفهم کمثل الجسد اذا اشتكى عضوًا تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى (بخاری و مسلم) تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ اگر ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا :

المومن للمومن كالبنیان یثد بعضه بعضاً (بخاری و مسلم) مومن دوسرے مومن کے لیے اُس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں :

المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یسلّمه ومن كان فی حاجة اخیه كان الله فی حاجة ومن فوج عن مسلم کربة فدرج الله عنه کربة من کربات یوم القیامة ومن سئماً سقره الله یوم القیامة۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرنا ہے نہ اس کی مدد سے باز رہنا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پورا کرنے میں لگا ہو گا اللہ اس کی حاجت پوری کرنے میں لگ جائے گا اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا اللہ تعالیٰ اُسے روز قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے نکال دیگا۔ (بخاری و مسلم)